

”پردہ“ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

..... کالج کے ایک ہندو پرنسپل صاحب کو میں نے آپ کی کتاب ”پردہ“ پڑھنے کو دی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا ہے وہ آپ کو بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ان کے سوالات کا جواب ہم بھی دے سکتے ہیں لیکن آپ خود جواب دینے کی تکلیف فرمائیں تو یہ ان کے لیے زیادہ لائق بخش ہوگا۔ جس خط کا حوالہ دیا گیا ہے وہ انگریزی میں ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

”آپ نے جو کتاب مجھے دی تھی اُسے میں نے ختم کر لیا ہے۔ میں نے اسے بہت غور سے پڑھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بڑی حد تک مصنف کے خیالات سے متفق ہوں۔ مگر ہندو سوسائٹی میں ہندو عورتوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا ہے اس پر مصنف کی رائے زنی ہندو رسم و رواج سے ناواقفیت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو قوم سیاسی حیثیت سے گر گئی ہو اس کے اندر بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہندو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، تاہم کسی ہندو خاندان میں عورت کو لوٹری کی حیثیت نہیں دی جاتی جیسا کہ مصنف نے ایک جگہ بیان کیا ہے بلکہ اس کے برعکس ایک دیوی کی طرح اس کی عزت و حرمت ملحوظ رکھی جاتی ہے

مگر آپ کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ انسانی سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ ایک ناپائیدار چیز ہے۔ وہ ہمیشہ تغیر قبول کرتی رہتی ہے، خواہ یہ تغیر بہتری کی جانب ہو یا بدتری کی جانب۔ ہمارے رواج، آداب و اطوار، زبان و لباس، خیالات و غیرہ ہم بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے بچوں کا ہمارے نقش قدم پر چلنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ غالباً وہ غلطیاں کرنے کا حق بھی مانگتے ہیں۔ میں چونکہ ایک آزاد خیال آدمی ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، اور یہی حق ایک عورت کو بھی ہے۔ پھر کیوں اس سے مطالبہ کیا جائے بلکہ ضرور اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے؟ مصنف نے

اپنے دعاوی کی تائید میں مغربی مصنفین کی تحریریں نقل کی ہیں، مگر یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ گجرات، جہاڑاٹر اور مدھاس کی سیاحت کرتا اور خود تحقیق کرتا کہ آیا ان صوبوں کی عورتیں جنہوں نے صدیوں سے کبھی پردہ نہیں

کیا ہے کسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں؟

پروفیسر صاحب کی طرح غالباً بہت سے دوسرے ہندو بھائیوں نے بھی میری کتاب کو ملاحظہ فرمایا ہوگا اور ممکن ہے کہ ان کو بھی یہ بات ٹری لگی ہوگی جس کی شکایت پروفیسر صاحب نے کی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں پہلک میں اپنے مدعا کی تشریح کر دوں۔ ہندو سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میری مراد وہ بڑاؤ نہیں ہے جو ہمارے ہندو بھائی عملاً اپنے گھروں میں اپنی بیویوں، بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں، بلکہ وہ حیثیت ہے جو ہندو قانون اور فلسفہ اجتماع نے عورتوں کو دی ہے۔ اس چیز کا میں نے جس حد تک مطالعہ کیا ہے، میں کسی قصص کے بغیر اس سے وہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں جو پروفیسر صاحب نے میری کتاب میں ملاحظہ فرمایا، اور میرا خیال ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی جو حضرات اصلاح معاشرت کے لیے کوشش کر رہے ہیں ان میں سے اکثر اپنی سوسائٹی میں عورتوں کی قانونی، معاشی اور معاشرتی حیثیت کو قابل اطمینان نہیں پاتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بہت سی خرابیاں اس انخطاط کا نتیجہ ہیں جس میں ہندو قوم صدیوں تک مبتلا رہی ہے، لیکن آخر ان کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے جب تک کہ جرات کے ساتھ ان کو محسوس اور متحقق نہ کیا جائے؟ میں نے اپنی کتاب میں صرف ہندوؤں ہی پر نہیں بلکہ موجودہ زمانہ کی مسلمان قوموں پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور مغربی اقوام پر تو میری تنقید بہت سخت ہے، مگر کسی قوم کے معاملہ میں بھی میری تنقید کا مقصد تحقیر اور عیب چینی نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کو اس غلطی پر تنبیہ کروں جس میں وہ مبتلا ہے اور اس اصلاح کی طرف توجہ دلاؤں جس میں بچے اسکی فلاح نظر آتی ہے۔

پروفیسر صاحب کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ نشوونما اور تغیر قبول کرنے والی چیز ہے۔ اور یہ بات خود پروفیسر صاحب نے تسلیم فرمائی ہے کہ تغیر لازماً صحیح ہی نہیں ہوتا، غلط بھی

ہوتا ہے۔ اب یہ سمجھنے سے میں معذروہوں کہ انسانی سوسائٹی یا اس کے افراد اگر غلط سمت میں تغیر قبول کر رہے ہوں تو انھیں بھوکریں کھانے اور تنہائی و نقصان کی طرف جانے کے لیے کیوں چھوڑ دیا جائے؟ کیوں نہ صحیح سمت کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے؟ خصوصاً جو شخص جاننا ہو کہ صحیح سمت کونسی ہے وہ اگر لوگوں کو غلط سمت میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر خاموش بیٹھا رہے تو اس کے مجرم ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ میں آزادی کے اس مفہوم کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آدمی کو حماقت اور خودکشی اور سوسائٹی کی تخریب کے لیے بھی آزاد ہونا چاہیے۔

”بلکہ بزور اسے جمور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے، پروفیسر صاحب کا یہ فقرہ بڑا دلچسپ ہے۔ اگر جبر سے مراد مار پیٹ کر بردستی نقاب ڈالنا ہے تو میں پروفیسر صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آیا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی پیش نہ آئے گا۔ البتہ اگر زور اور جبر سے مراد سوسائٹی کی رائے اور اس کے رائج کردہ طریقوں کی طاقت ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اجتماعی زندگی اس طاقت کے استعمال سے کبھی خالی نہیں رہی ہے اور نہ کبھی خالی کی جاسکتی ہے۔ سوسائٹی کا لفظ اس روزمرہی سے خالی ہو جائے گا جس روز وہ اس طاقت اور اس کے استعمال سے خالی ہو جائے گی۔ یہ آج کل کی آزاد خیالی ”سوسائٹی جس میں ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر آزاد خیالی کا مدعی اور آزادی رائے کے احترام کا دعوے دار ہے، اس کے دعووں کی حقیقت ایک ذرا سی آزمائش سے کھل سکتی ہے۔ ابھی کوئی شخص اس سوسائٹی میں ڈاڑھی رکھ لے، پھر آپ خود دیکھ لیں گے کہ اسے کس کس طرح شرمندہ کیا جاتا ہے اور کیسے کیسے فقرے اس پر کہے جاتے ہیں۔ یہ تجربہ آپ جب چاہیں کر سکتے ہیں، اس سے آپ کو بآسانی اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ ”آزاد خیالی“ کے اس دور میں بھی سوسائٹی کی فطرت نہیں بدلی ہے۔ وہ آج بھی افراد کی ”آزاد خیالی“ کے مقابلہ میں اپنی اجتماعی پسند اور اپنے اجتماعی معیار بہت بڑی ثقافت کو اسی جبر و زور کے ساتھ مسلط کر رہی ہے جس طرح ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب پُرانی سوسائٹی کے کسی شخص میں ان آزاد خیالی حضرات کے نشاء کے مطابق تغیر رونما ہوتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کو اس پر ملامت کرنے کا حق نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے عمل میں آزاد ہونا چاہیے، سوسائٹی کون ہوتی ہے کہ ایک آدمی کو

وہ طریقہ اختیار کرنے سے منع کرے جسے اُس نے خود اپنے لیے پسند کیا ہے۔ لیکن اگر نئی سوسائٹی کے کسی شخص میں ان کے منشاء کے خلاف تغیر واقع ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کوئی آزاد خیال عورت پردے کو خود پسند کر کے نقاب اوڑھنے، یا کالج کا کوئی طالب علم "مقائیت" اختیار کر کے ڈارٹھی اور نماز کا پابند ہو جائے اور سینما اور برج اور دوسرے یہودہ افعال سے پرہیز کرنے لگے۔ تو یہی "آزاد خیال" سوسائٹی پوری "دقیقا نو سنت" اور تاریک خیالی کے ساتھ وہ سب تدابیر اُس کے اس تغیر کو رد کرنے اور اسے اپنے سابق طریقے کی طرف پھیر لانے کے لیے استعمال کرتی ہے جو بڑانی سوسائٹی استعمال کیا کرتی تھی۔ بلکہ ٹرکی اور روس کے آزاد خیالوں نے تو اس بیسویں صدی میں "دقیقا نو سنت" کی حد کر دی ہے۔ "آزاد خیال" کے ان متعصب دشمنوں نے اُن عورتوں کے نقاب زبردستی فوج فوج کر پھینک دیے ہیں جو بے نقاب ہونا نہ چاہتی تھیں، اُن لوگوں کو زبردستی ہیٹ پہنوائے ہیں جو اپنے سروں پر چھتے دار چھتے نہیں رکھنا چاہتے تھے، پوری پوری آبادیوں کو لاطینی رسم الخط اختیار کرنے پر اُڑوئے قانون مجبور کیا ہے جو عربی یا فارسی رسم الخط کی پابند رہنا چاہتی تھیں۔

پروفیسر صاحب کا آخری مشورہ قابل قدر ہے، مگر وہ مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اس لیے شاید انھوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ میں تمام عمر کسی پُرانے مسلمان خاندان کے ماحول میں گھرا رہا ہوں اور پھر کتابوں کے مطالعہ سے کچھ رائیں میں نے قائم کر لی ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مجھے دنیا کو آنکھوں سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے کا اچھا خاصا موقع ملا ہے۔ گجرات، دکن، ہمارا اشر اور شمالی ہند میں بھی میں نے قریب قریب تمام طبقوں کے اندرونی و بیرونی حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور انہی مشاہدات نے مجھ کو بالآخر اس بات کا قائل و معترف بنا دیا کہ سوسائٹی کی اخلاقی صحت اور صالح نشوونما کے لیے معاشرت میں اُن حدود کی پابندی ضروری ہے جو اسلام نے تجویز کی ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جبکہ میں خود پردے کا مخالف تھا، حتیٰ کہ میں نے مصر کے ایک آزاد خیال شخص کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا جس میں اس نے "آزادی نسوان" کی پرزور حمایت کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا مسودہ بھی صفحہ ہستی سے ناپید ہو گیا اور

